(غلام گردش)

چارسیب

ایک صاحبِ فکر آدمی نے بہت سنجیدہ نکتہ اٹھایا۔ دو تین قبل ایک نشست میں ایک ایسی بات سامنے آئی کہ میں سوچ میں پڑ گیا۔ یہ میری اس سے پہلی ملاقات تھی۔ بات دہشت گردی سے شروع ہوئی۔ تاریخ پر مکالمہ ہوتا رہا۔ سانحہ پشاور پر سیر حاصل بحث ہوئی۔ اس نکتہ پر ہم تمام لوگ متفق تھے کہ مدت کے بعد وقت آیا کہ قوم کی اکثریت متفق نظر آتی ہے کہ طالبان کے فتنہ کو ملک کی سلامتی کیلیے خطرہ قرار دیا جائے۔ طالبان کو کسی تفریق کے بغیر سختی کیساتھ کچلا جائے۔ یہاں تک بات میں کوئی ابہام نہیں۔ مگر وہ شخص کہنے لگا کہ ہم تمام لوگ دہشت گردی کی اس اس شکل پر تو یکجا نظر آتے ہیں مگر اصل دہشت گردی کی جانب کسی کی کوئی توجہ نہیں! میرے لیے اصل دہشت گردی کا لفظ بالکل نیا تھا بلکہ میں اس سے بالکل اجنبی تھا۔ کہنے لگا کہ ہمارے ملک میں دہائیوں سے اربوں روپے کی کرپشن روزانہ کی بنیاد پر کی جارہی ہے۔ اس حقیقت کو حکومتی سطح پر چیئرمین نیب نے تسلیم بھی کیا ہے کہ خوفناک مالیاتی کرپشن انتہائی منظّم طریقے سے وقوع پذیر ہورہی ہے۔ اسکے اعداد و شمار بھی سب کے سامنے رکھے گئے ہیں۔ مگر اس "مالیاتی دہشت گردی" پر وہ قومی اتفاق رائے دیکھنے میں سامنے نہیں آسکا جو کہ حقیقت میں ہونا چاہیے تھا۔ میں نے اس نکتہ پر مختلف صاحب الرائے لوگوں سے تفصیل سے مکالمہ کیا۔ یہ ایک درست اَمر ہے کہ ہمارا دہشت گردی کی اس صنف پر وہ توجہ نہیں ہے جو کہ اس مسئلہ کو حل کرسکیں۔ وجوہات کیا ہیں، آپ سب جانتے ہیں!

معاملہ آگے سوچنے کا بھی ہے۔ تاریخ کے سفر سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ ملک دینے والے رہنما کیسے تھے! کیا تھے! وہ کیسا ملک بنانا چاہتے تھے۔ انکی ذاتی زندگی میں اجلاپن کتنا تھا! وہ مالیاتی امور میں کیسے تھے! بنیادی سوالات ہی یہیں سے شروع ہوتے ہیں اور شائد یہیں پر ختم ہوجاتے ہیں! ہمارے معاشرہ سے دلیل پر مکالمہ کی رسم تو کب کی اٹھ گئی۔ اب کوئی بھی یہ بتانے کو تیار نہیں ہے کہ اسکے پاس اربوں روپے کی دولت کیسے آئی! اگر آپ پوچھنے کی ہمت کریں تو آپ پر زندگی تنگ کردی جاتی ہے۔ اس ملک میں اگر آپ سچ کی راہ پر چلنے کی کوشش کریں تو آپکا سر آپکے شانوں پر نہیں رہنا دیا جائیگا۔ ہر شعبے میں حال ایک جیسا ہے۔ مختلف طرح کی دکانیں! مختلف طرح کا سودا، مگر مقصد محض لوٹ مار ہے! بیوروکریسی تو کب کی دم توڑ چکی؟

چند ماہ پہلے میں نے محترمہ فاطمہ جناح کی اپنے بھائی پر لکھی ہوئی ایک کتاب پڑھی۔ اصل میں یہ کتاب انگلش میں ہے۔ اردو ترجمہ سٹاف کالج کی لائبریری میں موجود تھا اور عنوان تھا، "میرا بھائی"۔ یہ کتاب بہت مختصر سی ہے۔ مگر اس کتاب کو پڑھنے سے قائد کی زندگی کے وہ ذاتی اور روشن پہلو نظر آتے ہیں جو اور کتابوں میں موجود نہیں۔ محترمہ فاطمہ جناح نے جس انداز میں اپنی زندگی اپنے بھائی کیلیے وقف کردی، وہ بذات خود قربانی کی ایک عظیم مثال ہے! مگر ہمارے سیاسی نظام میں اس عظیم خاتون کو جس عیاری سے خاک چاٹنے پر مجبور کیا گیا، وہ بھی اپنے تئیں ایک خوفناک داستان ہے۔ کہاں مادرِ ملت اور کہاں ایوب خان! مگر اس وقت کے بابوؤں اور سیاست دانوں نے اس عظیم عورت کو جس طرح الیکشن میں ہرادیا، وہ ہماری تاریخ کا ایک المناک حادثہ ہے۔ تھوڑا سا غور کیجئے، اگر ایوب خان کی جگہ مادرِ ملت اس ملک کی انتظامی سربراہ ہوتیں، تو ملک یکسر مختلف ڈگر پر چل پڑتا! مگر ہم نے اس

موقعہ پر انتہائی کوتاہ اندیش کا مظاہرہ کیا۔ وہی ہوا جو ہماری جیسی قوم کے مقدر میں لکھ دیا گیا ہے۔ صاحبان زیست! ذاتی ایجنڈا کے تحت حکومت اور مستقل حکومت! کیا لکھوں اور کیا نہ لکھوں!

قائداعظم زیارت میں مقیم تھے۔ اگر آپ زیارت جائیں تو آپکو احساس ہوتا ہے کہ یہ آج بھی ایک جنت نظیر جگہ ہے۔ خوبصورت درخت اور صاف ہوا! ڈاکٹروں نے قائد کو اس جگہ پر آنے کا طبی مشورہ اس شفاف ہوا کی بدولت دیا تھا۔ قائد جب زیارت آئے تو انکی صحت بہت گر چکی تھی۔ فاطمہ جناح کے بقول انہوں نے عملی طور پر کھانا پینا چھوڑ دیا تھا۔ وزن انتہائی تیزی سے کم ہو رہا تھا۔ اس وقت ہر ڈاکٹر نے مادرِ ملت کو یہی مشوہ دیا کہ کسی بھی طرح قائد کو کھانا کھلائیں۔ مگر وہ کھانے کی طرف بالکل آمادہ نہیں تھے۔ انکی بہن انکی تمام ذاتی عادات سے واقف تھیں۔ ذہن میں یہ خیال آیا کہ قائد ہندوستان میں کپورتھلہ کے چند باورچیوں کے ہاتھ سے بنا ہوا کھانا انتہائی رغبت سے تناول فرماتے تھے۔ تقسیم کے بعد وہ باورچی کہاں گئے، زندہ بھی تھے یا نہیں تھے، کسی کے علم میں نہیں تھا۔ مادرِ ملت نے قائد کی اجازت کے بغیر سٹاف کو حکم دیا کہ کپورتھلہ کے وہ باورچی تلاش کیے جائیں۔ دو تین دن کے اندر معلوم ہوا کہ وہ پاکستان آ چکے ہیں۔ چنانچہ انکو زیارت بلوایا گیا اور قائد کے کھانا بنانے کا کام انکے سپرد کر دیا گیا۔ آپکے ذہن میں یہ بات رہنی چاہیے کہ ہمارا عظیم رہنما اس وقت زندگی اور موت کی کشمکش میں تھا۔ موت کے سائے گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ محترمہ فاطمہ جناح نے ان باورچیوں کا بنا ہوا کھانا قائد کو پیش کیا۔ مادرِ ملت لکھتیں ہیں کہ قائد نے کھانا بڑی رغبت سے کھایا۔ ڈاکٹر صاحبان نے بھی سُکھ کا سانس لیا۔ کئی ہفتوں کے بعد یہ واقعہ پیش آیا تھا کہ قائد نے کھانے میں کوئی دلچسپی ظاہر کی۔ ایک دن گزرنے کے بعد جب وہ وہ دوبارہ ٹیبل پر آئے تو انہیں پھر کھانا بہت لذیذ لگا۔ اس بار قائد نے اپنی بہن سے سوال کیا کہ آپ نے یہ سب کچھ کس سے بنوایا ہے؟ جواب ملا یہ وہی کپورتھلہ کے باورچی ہیں جو ہندوستان میں قائد کیلیے کھانا تیار کرتے تھے! قائد نے یہ بھی دریافت کیا کہ انہیں یہاں کون لیکر آیا اور یہ زیارت کیسے پہنچے؟ مادرِ ملت نے جواب دیا کہ تمام باورچی انتظامیہ بڑی محنت سے زیارت تک لیکر آئی ہے۔ جواب سن کر قائد نے کھانا چھوڑ دیا۔ سٹاف کو حکم دیا کہ انکی چیک بُک لائی جائے۔ قائد نے اپنے ہاتھوں سے ان باورچیوں کے آنے جانے کے تمام اخراجات اور معاوضہ کے مطابق چیک دستخط کیا۔ سٹاف کو حکم دیا کہ ان باورچیوں کو ادائیگی کے بعد فوراً واپس بھجوایا جائے۔ قائد نے اپنی بہن کو وہ نایاب فقرے کہے کہ وہ ایک غریب ملک کے سربراہ ہیں اور حکومتی خرچے پر ذاتی کام کرنے کے ہرگز قائل نہیں۔ صاحبان! اب آپ اپنے اردگرد دیکھیے۔ میرا خیال ہے کہ اب سوال کرنا بھی بے سود ہے اور جواب کا انتظار کرنا بھی لاحاصل!

محترم عبداللہ صاحب پشاور میں قیام پذیر ہیں۔ انکی عمر اس وقت ستر برس سے اوپر ہوگی۔ پرانے سی۔ ایس۔ پی اور انتہائی محترم افسر! ذاتی کردار میں انتہائی اجلے انسان! مجھے کئی بار حیرت ہوتی ہے کہ سرکاری ملازمت میں ایسے ذہن اور اعلیٰ انسان بھی موجود رہے! ایک ہی نشست میں مجھے اپنی کم مائیگی اور کم علمی کا شدید احساس ہوا۔ چند دن پہلے وہ لاہور تشریف لائے ہوئے تھے۔ بات کرنے سے پتہ چلا کہ فلسفہ، تاریخ اور انتظامی امور پر مکمل علمی گرفت رکھتے ہیں۔ ہر حکمران سے اصولوں کی بنیاد پر لڑتے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تیرہ سال کے لگ بھگ پشاور کی ایک تدریسی درسگاہ میں گزار دیے۔ مگر مجھے انکی طبیعت میں کوئی رنج یا افسوس کا شائبہ تک نظر نہیں آیا۔ صوبہ کے چیف

سیکرٹری تک رہے۔انہوں نے ایک نشست میں قائد کے متعلق ایک نایاب قصہ سنایا۔بتانے لگے کہ وہ ایک تحصیل میں اسسٹنٹ کمشنر تھے۔اس تحصیل سے جناح صاحب کے اے۔ڈی۔سی کا بھی تعلق تھا۔جب بھی وہ نوجوان افسر اپنے آبائی گھر میں چھٹیاں گزارنے آتا تھا تو عبداللہ صاحب سے ملاقات کیلیے دفتر آتا تھا۔عبداللہ صاحب نے اس نوجوان افسر سے قائد کے متعلق ذاتی معلومات لینے کی کوشش کی۔مجھے یاد آتا ہے کہ یہ اے۔ڈی۔سی،نواب آف ٹانک کا بیٹا تھا۔اس نے عبداللہ صاحب کو قائد کی ذاتی عادت کے متعلق خوبصورت بات بتائی۔قائد گورنر جنرل ہاؤس کی اخراجات کے متعلق بہت محتاط تھے۔وہ کم سے کم کرچ کرنے کے قائل تھے۔ذاتی خرچے پر بھی کڑی نظر رکھتے تھے۔حکم تھا کہ دوپہر کے کھانے پر جتنے مہمان آئیں،پھل اسی تعداد سے پیش کیے جائیں۔یعنی اگر تین مہمان ہیں تو صرف تین ناشپاتیاں۔ایک دن غلام عباس صاحب تشریف لائے۔آپکو شائد معلوم نہ ہو کہ کشمیری رہنماؤں میں غلام عباس صاحب قائد کے بہت نزدیک تھے۔دوپہر کے کھانے پر قائد،محترمہ فاطمہ جناح اور غلام عباس کو ملا کر تین لوگ تھے۔کھانے کے بعد جب ڈائننگ ٹیبل پر پھل لائے گئے تو وہ چار سیب تھے۔غلام عباس صاحب واپس چلے گئے تو قائد نے A.D.C کو بلوایا۔پوچھا کہ جب کھانے کیلیے صرف تین اشخاص تھے تو چوتھا سیب کس کیلیے آیا!نوجوان افسر کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔کیونکہ قائد کا حکم تھا کہ جتنے لوگ کھانے پر ہونگیں،صرف اس تعداد میں پھل ہونے چاہیے اور چوتھا سیب قائد کے حکم کے صریحاً خلاف تھا۔نوجوان اے۔ڈی۔سی نے صرف یہ کہا کہ "سر غلطی ہوگئی"۔قائد نے انتہائی متانت سے اس افسر کو کہا کہ ایسی غلطی آئندہ نہیں ہونی چاہیے کیونکہ پاکستان جیسا غریب ملک سرکاری اخراجات میں اصراف کا متحمل نہیں ہوسکتا۔قائد نے اے ڈی سی کو معاف کردیا۔حکم یہی تھا کہ سرکاری خرچہ کو کم سے کم سطح پر رکھا جائے۔جب تک وہ عظیم رہنما زندہ رہا،سٹاف نے اس طرح کی غلطی دوبارہ نہیں کی۔یہ وہ شخص تھا جس نے اپنی محنت سے ہمیں پاکستان جیسا عظیم ملک دیا۔اگر عبداللہ صاحب نے یہ واقعہ بیان نہ کیا ہوتا تو شائد یہ بھی ماضی کی تاریک گلیوں میں گم ہوجاتا!

آج سے دس بارہ سال پہلے میں N.I.P.A لاہور میں ٹرینگ کررہا تھا۔جنرل (ر) شامی اس جگہ کے منتظم تھے۔ایک باکمال شخص !انتہائی محنتی اور مستحکم منتظم!کورس کے آخر میں انہوں نے پنڈی سے ایک ریٹائرڈ بریگیڈئر صاحب کو افسروں سے خطاب کیلیے بلوایا۔وہ ریٹائرڈ افسر کافی ضعیف تھے۔وہ قائد کے اے۔ڈی۔سی رہے تھے۔آخری دم تک انکے ساتھ رہے تھے۔انہوں نے قائد کی زندگی کے بہت سے واقعات بتائے۔کہنے لگے کہ جب میں پہلے دن ڈیوٹی پر گیا تو قائد نے دفتر میں بلوایا۔قائد کی نگاہوں میں اتنی طاقت تھی کہ ایسے محسوس ہوا کہ وہ انکے جسم سے آر پار ہورہی ہیں۔قائد کے سامنے کھڑا رہنا مشکل معلوم ہوا۔ہاں ایک اور بات !جب تک قائدرات کو سونہیں جاتے تھے،وہ ڈیوٹی پر نیچے موجود رہتے تھے۔اے۔ڈی۔سی کا کمرہ قائد کے سرکاری دفتر کے بالکل ساتھ تھا۔گورنر جنرل کے رہنے کا حصہ بھی اتفاق سے پہلی منزل پر دفتر کے تقریباً اوپر تھا۔انہوں نے قائد کی ایک عادت بتائی کہ وہ سوچتے ہوئے کمرے میں مسلسل چلتے رہتے تھے۔اس دوران وہ سگریٹ بھی پیتے رہتے تھے۔قائد کے جوتے اور فرش پر چلنے کی آواز نچلے کمرے میں گونجتی رہتی تھی۔بتانے لگے کہ جس دن کوئی اہم فیصلہ کرنا ہوتا تو قائدرات کا بیشتر حصہ کمرے میں پیدل چلتے ہوئے گزار دیتے تھے۔جوتوں کی آواز سے گورنر جنرل ہاؤس کا نچلا حصہ باقاعدہ گونجتا رہتا تھا۔کہنے لگے کہ اکثر اوقات قائد صبح تک اسی طرح چلتے رہتے

تھے۔جب جوتوں کی آواز ختم ہوجاتی تھی تو اے۔ڈی۔سی سمجھ جاتا تھا کہ اب قائد سو چکے ہیں۔لہذا وہ چپکے سے اپنے دفتر سے واپسی گھر چلا جاتا تھا۔دو گھنٹے کی اس نشست کے بعد بریگیڈئر صاحب بھی زاروقطار رو رہے تھے۔شرکاء کی اکثریت کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔انہوں نے قائد کے آخری سفر کی روداد بھی بڑے تفصّل سے بیان کی۔قائد کی اکلوتی بیٹی جب تشریف لائیں تو غم کی تصویر بنی ہوئی تھیں۔میں یہ موضوع کسی اور دن کے لیے سنبھال رکھتا ہوں۔

تین دہائیوں سے سول سروس میں ہوں! بے شمار اہم لوگوں کے ساتھ کام کیا ہے! میں نے بہت کم رہنماؤں میں سرکاری اخراجات پر رحم کرنے کی عادت دیکھی ہے! پنجاب کے ایک گورنر کے داماد مجھے ملنے آئے تو معلوم ہوا کہ انکے زیر استعمال گاڑی بھی گورنر ہاؤس کی ہے! گورنر ہاؤس کی پچیس تیس گاڑیاں گورنر صاحب کے عزیز رشتے داروں کے استعمال میں تھیں! یہ تقریباً بیس برس پہلے کی بات ہے! موجودہ حالات کیا ہیں! میں اس پر تبصرہ کرنے سے قاصر ہوں! جس دن ہمارے رہنماؤں نے اس عظیم قائد کے چوتھے سیب پر کہے گئے احکامات کو ذہن نشین کرلیا، یہ ملک بدل جائیگا! ہمارے تمام مسائل خود بخود حل ہوجائینگے! پاکستان تیزی سے ترقی کی شاہراہ پر سرپٹ دوڑنا شروع کردیگا! پھر ذہن میں ایک شبہہ سا جنم لیتا ہے کہ کیا آج کے پاکستان میں یہ ممکن ہے؟

راؤ منظر حیات

Dated:26-12-2014